سعادت سعید*

سائنسی ویژن اور وجدانی منطق بحوالہ ذات اور قبائے صفات: عکسی مفتی کی ’تلاش‘

کتاب: تلاش-اللہ: ماورا کا تعین (Allah: Measuring the Intangible)
مصنف: عکسی مفتی
مترجم: محجبہ عارف
ناشر: الفیصل ناشران، لاہور، ۲۰۱۲ء۔
کل صفحات: ۵۳۱

علت ومعلول کے سلاسل میں جکڑی سائنس فلسفہ اور تصوف کی دنیاؤں میں موجود داخلی وجدانی، ایقانی اور اختراجی حوالوں کو قبول کرنے سے منکر رہی ہے۔اس کے نتیجے میں اس نے معروضی کاروباری نظام سے نسبت ہی میں عافیت جانی ہے۔اس نے میکانکی عقل کو وجدان،الہام اور وحی وغیرہ کے وسیلے سے انسانوں تک پہنچنے والی دانش پر ترجیح دی ہے۔باطنی فلسفے اور صوفیانہ نظام، وجدان اور باطنی احساس کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں اور عقل محض کی کاروباریت کو چند روزہ مادی زندگی کا شاخسانہ سمجھتے ہوئے اس سے اجتناب کو اپنے حق میں بہتر جانتے ہیں۔

بنیاد جلد ۵، ۲۰۱۴ء

سعادت سعید

شیخ اکبرابن عربی کے وجودی خیالات ہمارے کئی صوفیانہ مسالک میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ان کا خیال تھا کہ ہمارے احساسات و ادراکات سے ماورا ایک ازلی وابدی حقیقت کا وجود مسلمہ ہے۔یہ حقیقت کل کائنات کی خالق ہے۔اسی کی بدولت ہمیں دنیا میں عمل کرنے کا موقع ملا ہے۔یہ حقیقت ہمہ وقت اپنی شان دکھاتی ہے۔اس کے امکانات زندہ اور متحرک ہیں۔اسے نمود وظہور سے سروکار ہے۔اس کی پیدا کردہ کائنات میں ترتیب و تنظیم ہے۔یہ کائنات اور عالم اس کی شان ظہور کا نتیجہ ہے۔

ایک مخصوص نہج کے معاشرے کا فرد ہونے کے ناتے ہمیں بچپن سے جس منطق سے واسطہ پڑتا ہے اس میں کسی ایسی ہستی کا متواتر حوالہ موجود رہتا ہے کہ جو شہ رگ کے قریب ہے، جو سمیع بھی ہے اور بصیر بھی ہے جو غائب بھی ہے اور حاضر بھی ہے۔وہ ہستی اللہ کی ہستی ہے۔اللہ کل کائنات کا آقا ہے۔انسان عبد ہے اور وہ معبود ہے۔زمینوں اور آسمانوں میں جو کچھ ہے وہ اللہ کا تخلیق کردہ ہے۔تمام انسان اپنے اعمال میں خود مختار ہیں اس لیے روز حساب ان کی باز پرس کا دن بھی ہے۔فارسی اور اردو کے تمام اہم کلاسیکی شعرا اور ادبا کی کتب میں یہ تصورات عکس فگن نظر آتے ہیں۔ہمیں بتایا جاتا تھا اللہ غفور ہے، رحیم ہے، کریم ہے، ستار ہے، حیی ہے، قیوم ہے۔یہ اللہ کے اسما ہیں۔ڈاکٹر الف۔د۔نسیم لکھتے ہیں:

> اسما: اسم کی جمع ہے۔مراد یہاں اسمائے الٰہی ہیں۔اللہ تعالٰی کا ذاتی اسم صرف ایک ہے اللہ۔۔۔باقی جتنے اسما بھی ہیں وہ صفاتی ہیں۔یہ عام طور پر ننانوے کے قریب بتائے جاتے ہیں جیسے رحمٰن، رحیم، قہار، جبار، قادر، مصور، خالق، رازق، محی، ممیت وغیرہ وغیرہ۔ان اسما کو قرآن وتصوف کی اصطلاح میں اسمائے حسنٰی کہتے ہیں۔ذات کے کسی خاص طریق سے جلوہ گر ہونے کو صفت کہتے ہیں اور جب وہ کسی خاص صفت سے متصف ہوتی ہے تو اسم کہلاتی ہے۔[۱]

سوال یہ ہے کہ ہماری زندگیوں میں اسمائے حسنٰی کی کیا اہمیت ہے؟ اس کا سادہ جواب یہ ہے کہ ان اسما کی بدولت یا ان کے معنی کی تفہیم کے تناظر میں ہمیں اپنا سماجی اور فکری لائحہ عمل مرتب کرنا ہوتا ہے۔پرانے مذہبی معاشروں میں یہ کام سادہ اور آسان تھا۔نئے عہد کے نئے علتی معلولی تجربہ گاہی

سلاسل میں لائحہ عمل کی ترتیب قول محال مثتی دکھائی دیتی ہے۔شاید اس لیے کہ انسان کی نظری فکری بنیادوں پر ''خوگر پیکر محسوس'' بن چکی ہے۔اس کے سامنے ان دیکھے خدا کا تصور لانا کارعبث میں شمار ہو سکتا ہے۔تاہم منطق استقرائی کی دلدلوں میں اترنے کے بجائے اہل ایمان نے منطق استخراجی کی بنیاد پر تصور خدا کو ماننے میں عافیت جانی ہے۔انھوں نے ''اسم اعظم'' کی بنیاد پر لاتعداد بھاری اور مقفل دروازوں کے طلسمات کو توڑا ہے۔عکسی مفتی نے اس موضوع پر انگریزی میں Allah: Measuring the Intangible کے عنوان سے ایک عمدہ کتاب تحریر کی ہے۔اس کتاب کو اردو میں منتقل کرنے کا دیدہ ریز اور اعصاب شکن کام ڈاکٹر مجیحہ عارف نے کیا ہے۔

اس کتاب کا تعارف ڈاکٹر رالف ڈبلیو ہڈ (Ralph W. Hood) نے یوں کروایا ہے:

> This is a very useful book to introduce people to a view that avoids the contemporary politicalization and the association of Islamic fundamentalists with terrorism. It is a good overview of various philosophical and scientific options, each of which is identified in terms of its own limits.
>
> The ease in which the text can be read is a definite plus and suggests that the author ought to seek a publisher who can give this text a wide audience. The market definitely is greater than merely college students and the book could be quite successful given proper marketing.
>
> Our own reading of the text takes seriously the author's view that without actual experience of something, one cannot really know. So we see this as a mystical approach to Islam, in which only those who experience that which is more inconclusive can understand that which is less inclusive. In this sense, the author persuades the reader

> that Islam and Allah are realities to be experienced and not fictions to be reductively understood by science, philosophy, or religious studies whose own limitations are both appreciated and recognized.[۲]

ڈاکٹر رالف ڈبلیو ہڈ مذہب کی سائنسی بنیادوں کی تلاش کے حوالے سے جانے پہچانے سائنس دان ہیں۔وہ بارہ سے زائد کتب کے مصنف ہیں۔انھوں نے مذہب کی جس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے اسے یا اس سے متعلق باطنی تجربے کی بابت اپنی رائے دیتے ہوئے ڈاکٹر الف۔د۔نسیم یوں رقمطراز ہیں:

> صوفیا کے نزدیک وجود صرف ایک ہے اور وہ اللہ کا وجود ہے۔اللہ کے سوا جو کچھ ہے وہ اعتباری اور وہمی ہے، کیونکہ خدا کے وجود کی وجہ سے قائم ہے، اس لئے اس کا کوئی وجود نہیں۔اور جس کا وجود نہ ہو اور اگر ہو تو محض خیالی ہو: اس سے دل لگانا عقلمند کا شیوہ نہیں۔اس کی نیرنگیوں کے تماشے میں محو ہونا دانش مندی نہیں۔اس کے کھیل تماشوں اور اس کے لہو ولعب سے دل کو لبھاتے رہنا مقصد زندگی کو پس پشت ڈال دینا ہے۔عقل منداس سے دل لگائے گا جو مستقل اور غیر فانی ہوگا اور وہ صرف ایک ہی ذات ہے، اللہ۔اس کے سوا جو کچھ ہے، یعنی ماسویٰ اللہ، گزشتنی ہے۔آدمی کو چاہیے کہ اپنے قلب و ذہن کو ماسویٰ اللہ کے کوڑے کرکٹ سے پاک و صاف کرے تاکہ اس میں مہمان عزیز یعنی اللہ تعالیٰ یا اس کے انوار و تجلیات کا گذر ہو سکے۔قلب آدمی ایک ایسا گھر ہے جس میں اللہ اور ماسویٰ اللہ بیک وقت نہیں سما سکتے۔جہاں اللہ ہوگا، ماسویٰ اللہ نہیں ہوگا اور جہاں ماسویٰ اللہ ہوگا، اللہ نہیں ہوگا۔صوفی کا قلب انبیا کے بعد واحد قلب ہے جس میں ماسویٰ اللہ کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔صحابہ اور تابعین اسی میں شامل ہیں۔قلب کو ماسویٰ اللہ سے پاک کرنے کا طریقہ مدرسے میں نہیں خانقاہ میں بتایا جاتا ہے۔یہ حدیث کسی درویش بے گلیم سے پوچھنے والی ہے۔

ہر چیز کو الغرض فنا ہے   اللہ کی ذات کو بقا ہے
(شاد عظیم آبادی)

خندہ گل بے نمک فریاد بلبل بے اثر   اس چمن سے کہہ تو جا کر کیا کریں گے یاد ہم

(مرزا رفیع سودا)

اے گل صبا کی طرح پھرے اس چمن میں ہم   پائی نہ بو وفا کی ترے پیرہن میں ہم
اس کشمکش سے دام کی کیا کام تھا ہمیں   اے الفت چمن تیرا خانہ خراب ہو
(مرزا رفیع سودا)

اگر اٹھے تو آزردہ جو بیٹھے تو خفا بیٹھے   لگایا جی کو اپنے روگ جب سے دل لگا بیٹھے
(شیخ ابراہیم ذوق)[۳]

عہد حاضر میں فلسفۂ تشکیک کے زیر اثر ایک عالم کائنات فکر میں آوارہ خرامی کرتا نظر آتا ہے۔ایمان بالقلب کی منطق کو وہم اور غیر معروضی جانتے ہوئے سائنسی فکر کے رسیا دانشور اور فلسفی بوعلی کی طرح ''غبار ناقہ'' میں گم ہیں اور صوفی منش فقیروں نے ''پردۂ محمل'' کو جا لیا ہے۔

عکسی مفتی کی کتاب پر ڈاکٹر فریڈ ایلن ولف (Dr. Fred Alan Wolf) نے بھی رائے دی ہے۔ڈاکٹر موصوف نے ''خدا نے کائنات کیسے تخلیق کی'' اور ''زمانی پھسلاہٹیں اور مکانی پیچ وخم'' کے موضوعات پر دو کتابیں لکھی ہیں۔علاوہ ازیں سائنسی موضوعات پر ان کی کئی اور کتابیں بھی ہیں۔انھوں نے عکسی مفتی کی کتاب پر رائے دیتے ہوئے درست لکھا ہے:

> Uxi Mufti's Allah: Measuring the Intangible is a delight to read, both for its fine prose and for its depth in dealing with the connection between Spirituality and Science. Recognizing the ancient Arabic/Hebrew letters as having a sacred projective as well as a descriptive usage, he shows how our modern physical descriptions of the universe parallel meanings found in the ancient Spiritual texts. I recommend this book for both scientists and followers of all of our Western spiritual traditions of Islam, Christianity, and Judaism.[۴]

ازمنہ قدیم سے انسان نے حقیقت خداوندی پر غور وخوض شروع کیا اور عہد جدید تک آتے

آتے اس کے لاتعداد پہلوؤں اور جہتوں کی نشان دہی کر ڈالی قدیم عراق، مصر، چین، ہندوستان، یونان، افریقہ ، لاطینی امریکہ میں قبائلی، شاہی ادوار میں خدا کے اسما کے حوالے سے بے شمار حکایتیں، اساطیری حوالے، داستانی اشارے اور طلسماتی نشان موجود ہیں۔ یہاں البیرونی کی کتاب الہند سے چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں تا کہ تصور خدا کی حکایاتی، اساطیری، داستانوی اور سحر کار روایتوں کا اندازہ ہو سکے:

> اللہ پاک کی شان میں ہندوؤں کا اعتقاد یہ ہے کہ وہ واحد ہے، ازلی ہے، جس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا، اپنے فعل میں مختار ہے، قادر ہے، حکیم ہے، زندہ ہے، زندہ کرنے والا ہے، صاحب تدبیر ہے، باقی رکھنے والا ہے، اپنی بادشاہت میں یگانہ ہے، جس کا کوئی مقابل یا مماثل نہیں ہے۔ نہ وہ کسی چیز سے مشابہ ہے اور نہ کوئی چیز اس کے ساتھ مشابہت رکھتی ہے۔[۵]

البیرونی نے اپنے ان خیالات کو کتاب پاتنجلی میں موجود خدا کی ذات وصفات اور عبادت کے متعلق چند مکالموں سے اخذ کیا ہے۔ ایک مکالمے میں خدا کے متکلم ہونے کا خیال ظاہر کیا گیا ہے۔ اس کے علم کو ازلی قرار دیا گیا ہے۔

> جیسا کہ اس نے ''بید'' [ویدا] میں جس کو اس نے ''برہما'' پر نازل کیا، فرمایا ہے کہ ''حمد کرو اس کی جس نے وید [ویدا] کے ساتھ کلام کیا''۔[۶]

> اس کے نام کا ہونا اس کی ذات کی موجودیت کو ثابت کرتا ہے۔ اس لیے کہ خبر بغیر کسی شے کے اور اسم بغیر کسی مسمی کے نہیں ہوتا۔[۷]

البیرونی نے ہندو مذہب میں تصور خدا کی حقیقت پر بھگوت گیتا کے تناظر میں بھی اظہار خیال کیا ہے:

> [ارجن سے باسدیو کا کہنا ہے] ''بلاشبہ میں وہ کل ہوں جس کی نہ ولادت سے ابتدا ہے نہ موت سے انتہا۔ میرا مقصود اپنے فعل سے مکافات نہیں ہے نہ میں محبت یا عداوت کی بنا پر ایک طبقے کے مقابلے میں دوسرے طبقے کے ساتھ کوئی خصوصیت رکھتا ہوں۔''[۸]

> کتاب سانک میں فعل اور فاعل کے تعلق سے حتمی رائے یہ ہے کہ کل فعل مادہ کا ہے۔ اس لیے کہ وہ مادہ ہی ہے جو صورتوں میں گرفتار ہوتا اور ہیر پھیر کرتا رہتا ہے اور پھر اس کو چھوڑتا رہتا ہے۔ پس فاعل وہی ہے اور ساری چیزیں جو اس کے تحت میں ہیں فعل کی تکمیل میں اس کی مددگار ہیں۔[۹]

البیرونی نے ہندوؤں اور یونانیوں کے نظریات کی مماثلتوں پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

> قدیم یونانیوں کے خیالات اسی قسم کے تھے جیسے ہندوؤں کے ہیں۔ ان میں سے کوئی یہ رائے رکھتا تھا کہ کل چیزیں ایک ہیں۔ پھر کوئی بالکون ایک ہونے کا قائل تھا اور کوئی بالقوہ ایک ہونے کا اور کہتا تھا کہ مثلاً انسان کو پتھر اور جماد ات پر اس کے سوا کوئی فضیلت نہیں ہے کہ انسان مرتبہ میں علت اولیٰ سے قریب ہے، ورنہ وہ بھی جماد ہے۔[۱۰]

قدیم یونان میں پارمی نائڈس (Parmenides) اور زینوفینیز (Xenophanes) نے کائنات کو اصول وحدت کے تحت سمجھنے کا جتن کیا اور کثرت الاصنام کی جگہ خدائے واحد کا امیج ابھارا۔ اصل ہستی خدا ہے اور اس میں تغیر ممکن نہیں۔ زندگی جس ہستی کی عطا ہے اسے منقسم نہیں کیا جا سکتا۔ ہر جا ایک ہی بسیط، اور مسلسل ہستی منعکس ہے۔ وہ ضرورت اور احساس سے ماورا ہے۔

ان کے خیال میں حواس فریب نظر اور غیر حقیقی علم کو سامنے لاتے ہیں۔ عقل کے وسیلے سے ہستی اولیٰ کا بیان کیا جا سکتا ہے اسی نقطۂ نظر کو افلاطون نے بیان کیا اور دنیا میں موجود کثرتوں کو اعیان ثابتہ کا عکس قرار دیا۔ شنکر اچاریہ نے ہندوستان میں اسی فلسفے کا پرچار کیا اور دنیا کی ہر شے کو فریب اور وہم جانا۔ اکثر یونانی فلسفی ازلی، ابدی اور غیر متغیر حوالوں کو استعمال کرتے ہوئے وجود مطلق کو ہر اعتبار سے غیر متغیر سمجھتے تھے یوں متغیر اور حادث زندگی کو اصل جاننا ان کے لیے مشکل تھا۔ نئے عہد کے کئی فلسفی جن میں بارکلے اور سپنوزا بھی شامل ہیں اسی نوع کی منطق کے اسیر ہو کر معروضی حقائق کے منکر ٹھہرے۔ ان کے برعکس عقائد رکھنے والے مغرب ومشرق کے فلسفیوں نے حقیقت مطلق کو حرکی اور غیر جامد سمجھا۔

ہیراکلیٹس (Heraclitus) کے نزدیک خدا کو مادی آتشی کائنات کے انبج میں سمجھنا چاہیے۔وہ عقل کل ہے اور سکون وثبات فریب نظر ہے۔زندگی ہمہ وقت متغیر ہوتی رہتی ہے اس کے بطن میں موجود جوہر ازلی اور ابدی ہے۔علامہ اقبال نے اپنی شاعری میں ثبات کی اگر بات کی ہے تو وہ تغیر کے حوالے سے ہے۔پارمی نائڈس (Parmenides) نے ثبات وتغیر کے فلسفے کو ایک کیا اور ہستی مطلق کو بیک وقت لامحدود اور واحد قرار دیا۔فلوطینس (Plotinus) نے بھی ہستی مطلق کی بات کی اور کہا کہ عقل کل اور روح کائنات اسی کی جانب سے میسر آئیں۔اس نے خیر کے ساتھ شر کی بھی بات کی اور یوں انسان اور کائنات کی متغیر حالتوں کا جواز پیدا ہوا۔اس نے جزو کے کل میں مدغم ہونے کو اہمیت دی۔یوں اسے ہر شے اسی سرچشمے کی جانب لوٹتی نظر آئی جو اس کا منبع و ماخذ ہے۔الطاف جاوید کا خیال ہے:

> مسلم فلسفیوں اور صوفیا کے نزدیک وحدت کی تلاش کا مسئلہ محض فلسفیانہ اپچ نہیں رہا بلکہ شرک سے بچنے کے لیے غور وخوض کیا گیا۔قرآن حکیم نے انسان دشمن اقدار میں سے سب سے زیادہ اہمیت شرک کو دی ہے اور اسے گناہ عظیم قرار دیا ہے۔لہٰذا اگر اشیا کی ہستی، وجود یا ہویت (being) حق تعالی کے علاوہ کسی اور ہستی مطلق سے مستعار ہے تو شرک جلی لازم آتا ہے، اسی سبب اکابر صوفیا نے ابلیس و شیطان کے وجود کو بھی حق تعالی سے ہی مستعار تسلیم کیا ہے۔ورنہ تعدد الٰہ کا ماننا لازم قرار پاتا ہے۔توحید کامل کا تقاضا ہے کہ مستقل اور حقیقی وجود صرف اور صرف حق تعالی کا ہی تسلیم کیا جائے۔باقی تمام مخلوق کا وجود مستعار اور عارضی تصور کیا جائے۔یہ بات محض حق تعالی کے بالمقابل کہی گئی ہے ورنہ مسلم صوفیا نے حواس سے حاصل ہونے والے علم کو غیر حقیقی قرار نہیں دیا اور یہی مسلک ابن عربی کا بھی ہے، ان کے نظریہ علم میں حواس کی شہادت معتبر ہے،اس لیے ان کے نزدیک سائنسی تحقیقات اور عمرانی مسائل اپنی حیثیت میں واقعی اور حقیقی ثبوت رکھتے ہیں۔اگرچہ ثانوی درجہ کے متصوفین نے وحدت الوجود کی غلط تعبیر کے باعث عالم کو غیر حقیقی اور عارضی قرار دے کر اپنے آپ کو جدوجہد سے الگ کرلیا اور حیات گریز رہبانیت کی دلدل میں پھنس گئے مگر یہ ان کی ذاتی غلطی تھی۔اس کا اسلام اور اس کے فلسفہ سے کوئی تعلق نہیں

> ہے۔۔۔۔قرآن نے حقیقت مطلقہ کا حرکی (Dynamic) تصور دیا جس کی شان ہر آن بدلتی رہتی ہے اور انھی شیون متجددہ سے تاریخ کے مختلف ادوار تشکیل پاتے ہیں۔اسی تصور حقیقت کے پیش نظر ابن عربی نے اس کے نظریہ صدور میں اصلاح کی۔[11]

> اس عہد میں سیکولرازم اور فلسفہ مادیت کی ناکامی، سماجی حرکیات کی سائنس کی تدوین اور ہائی ٹیکنالوجی کے سبب اس بات کا امکان پیدا ہوگیا ہے کہ فلسفہ وحدت الوجود اور اس کے مضمرات کو عملی جامہ پہنایا جا سکے۔ان حالات کی روشنی میں علی شریعتی کا یہ فرمان کہ اکیسویں صدی مذہب کی صدی ہے درست قرار پاتا ہے۔[12]

اس سیاق وسباق میں عصر حاضر کے تشکیک میں مبتلا اذہان کو کائنات کے پس پردہ حقیقت اولیٰ کی جانب رجوع کرنا ہوگا۔عکسی مفتی نے اس حقیقت کی مختلف اسما میں پوشیدہ قوتوں اور امکانات کی بات کی ہے۔احمد جاوید کے بقول:

> کلاسیکی روایتوں میں خدا کے تصور پر تشکیک کا عمل مدت سے موجود رہا ہے لیکن دور جدید میں تشکیک ایک ایسا رویہ بن گیا ہے جس کی بنیاد فلسفیانہ اور علمی کم، رسمی زیادہ ہے۔اس رویے کا اگر تجزیہ کیا جائے تو یہ واضح طور پر نظر آئے گا کہ اس کی بنیاد خاص طرح کی سائنس پر ہے۔جدید سائنسی علوم نے بعض اسباب کی بنا پر اپنی حدود کے اندر محدود رہنا قبول نہیں کیا بلکہ ان کی ساخت میں غیر ضروری طور پر ایک فلسفیانہ عنصر بھی داخل ہوگیا جس کی وجہ سے بعض سائنسی نظریات سوشل تھیوریز بھی بن گئے۔مثلاً نظریۂ ارتقا، بگ بینگ تھیوری، نظریۂ اضافیت وغیرہ۔اس صورت حال کا نتیجہ یہ نکلا کہ سائنس نے اپنے نظریات کو مابعد الطبیعی (metaphysical) اور مذہبی دائروں میں بھی حجت بنانے کی رسم کا آغاز کر دیا۔چونکہ سائنس جدید ذہن کے لئے ایک قطعی اور حتمی علم بن چکی ہے، اس لیے اس کے حوالے سے پیدا ہونے والے تمام تصورات خود بخود سند اور معیار حقیقت بن جاتے ہیں۔سائنسی علوم کو یہ حیثیت حاصل ہو جانے سے انسانی شعور کا وہ metaphysical perspective معطل ہو کر رہ گیا جو حقائق کو ایک باقاعدہ نظام استدلال کے ساتھ قبول کرتا تھا۔سائنس کے غلبے کی وجہ سے دنیا کو دیکھنے کے وہ اسالیب رفتہ رفتہ کمزور پڑتے چلے گئے جو ہستی اور وجود کے

پورے نظام کو کسی تصورِ حقیقت کی روشنی میں دیکھتے اور چیزوں کو ان کی طبعی سطح تک محدود نہیں رہنے دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ شعور کی جدید صورتیں خود شعور ہی کے بعض مطالبات کو نظر انداز کر کے بنی ہیں۔ مثال کے طور پر شعور کا یہ مسلمہ ہے کہ کائنات کی کوئی واحد حقیقت ہے جو اس سے ماورا بھی ہے۔ یعنی کائنات جس نظامِ صورت کا نام ہے وہ ایک ہی حقیقت کا اظہار ہے جو خود ظاہر نہیں ہے۔ کائنات کا تجزیہ کرنے والے جدید سائنسی علوم نے اس مسئلے کو اس طرح ملحوظ نہیں رکھا جیسے کہ سائنس کی قدیم روایتوں میں نظر آتا ہے۔ ان علوم نے خود کو چیزوں کے مکینکس تک محدود رکھنے کی بجائے ان کے حقائق کو clinically دریافت کرنے کی ذمہ داری لے کر انسانی ذہن میں ایک ہمہ گیر انتشار کی بنیاد ڈال دی۔ دوسری طرف سائنس کو اپنی presentation کے لئے جن غیر محدود ذرائع کی کمک حاصل ہے، انھوں نے پیچیدہ سائنسی نظریات کو بھی عام آدمی کے لئے اتنا پرکشش بنا دیا کہ وہ اس سے باہر نکلنے کے خیال کو ہی ناگوار محسوس کرتا ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ سائنسی تصورات کو ذرا بھی سمجھے بغیر ایک جدید تعلیم یافتہ ذہن ان سے برآمد ہونے والے دعووں (judgements) کو اٹل حقیقت مان کر انھیں بلا چون و چراں اور من و عن قبول کر لیتا ہے۔۔۔۔ سائنٹزم کے علاوہ بھی کچھ چیزیں ہیں جو جدید ذہن میں تشکیک کی بنیاد ڈالتی ہیں۔ ان پر بھی غور کرنا ضروری ہے۔ ان میں سے پہلی چیز یہ ہے کہ مذہب کو شعور اور اخلاق کی بلند ترین سطح پر موجود بلکہ غالب رکھنے والی قوت ہم نے پچھلی دو تین صدیوں سے گنوا رکھی ہے۔ دنیائے جدید میں مذہب سے تعلق رکھنے والے علوم اس علمی اور ذہنی معیار پر پورے نہیں اترتے جو غیر مذہبی علم نے ہمہ گیر انداز سے نہ صرف یہ کر پیدا کر دکھایا بلکہ اس میں مسلسل ترقی کا سامان بھی پیدا کر دیا ہے۔ فلسفے اور سائنس وغیرہ سے تربیت پانے والا ذہن مذہبی تصورات سے بننے والے ذہن سے اتنا آگے بڑھ چکا ہے کہ اگر اس کا ابھی سے ازالہ نہ کیا گیا تو اندیشہ ہے کہ آگے چل کر تمام مذاہب اور ان کا بیان ذہنی پسماندگی کے اظہار سے زیادہ کچھ نہ سمجھا جائے گا۔ یہ بات خاصی تشویشناک ہے کہ مذہبی ذہن انسان کے بڑے ذہنی مسائل میں کوئی مثبت کردار ادا کرنے سے بری طرح قاصر ہے۔ یہ world view نہیں رکھتا کہ جس کی بنیاد پر انسانی زندگی کی تشکیل کرنے والے عناصر کی نشان دہی ہو

> سکے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ذہن کی بہترین صلاحیتیں مذہبی امور سے غیر متعلق ہو کر رہ گئی ہیں اور ذہن کی تشکیل میں عقائد وغیرہ کا کوئی حصہ نہیں رہا۔[۱۳]

عہدِ نو میں اسمائے حسنٰی کے صفاتی سلسلوں سے مادی کائنات کی لاینحل گتھیوں کو سلجھانے کے جس سلسلے کا آغاز ممتاز مفتی اور ان کی قبیل کے دیگر لوگوں نے شروع کیا تھا اور جس کے پس منظر میں ابن عربی کے اللہ جل جلالہ کے حوالے سے ذاتی اور صفاتی وضاحتوں کے امور بھی موجود رہے ہیں، وہ دورِ نو کے ان تمام تر فلسفوں اور علمی سلسلوں کو خدا کی تفہیم کے ضمن میں ناکافی قرار دیے بغیر اپنی معنویت واضح کرنے سے قاصر رہیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ عکسی مفتی نے اللہ جل جلالہ کی صفات کے حوالے سے لکھی گئی اپنی کتاب **اللہ: ماورا کی تلاش** میں اپنے عہد کے علوم وفنون کے کسی گوشے کو نظر انداز نہیں کیا جو خدا، کائنات اور انسان سے تعلق رکھتا ہو۔ اس حوالے سے انھوں نے متوازی علم کی بات بھی کی ہے کہ جو مظاہرِ عالم کو نئے زاویوں سے سمجھنے کا قصد رکھتا ہو۔

تردید اور تنقید کے دوائر نے انسان کو جس طرح مسائل کے کولھو کا بیل بنا رکھا ہے عکسی مفتی کی کتاب اسے اس کی صدیوں پرانی الجھنوں سے نجات دلانے کا کام کرنے والی ہے۔ تجربیت، منطقی اثباتیت، وجودیت، مارکسزم، طبیعیات، حیاتیات، نفسیات کے نئے دبستانوں کے معلوماتی اور تجزیاتی مطالعے **اللہ: ماورا کی تلاش** کو وقیع کتابوں کے زمرے میں رکھنے کے لیے کافی ہیں۔ سرمایہ داری فلسفوں کی نئی دریافتیں اور اپنے موضوع کی مناسبت سے ادبی مطالعے عکسی مفتی کی ذہانتوں پر مہرِ تصدیق ثبت کر رہے ہیں۔ یہ کتاب قاموسی وسعتیں رکھتی ہے اس میں قدیم و جدید معاشرتی، عمرانی، بشریاتی، مذہبی، اساطیری حوالوں کی بہتات اس امر کی گواہی ہے کہ عکسی مفتی نے چین، یونان، ہندوستان، ایران وعرب کے قدیم علوم وفنون سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے عہد کی مغربی دانش کو اس کی پوری گہرائیوں سمیت صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا ہے۔ خدا، کائنات اور انسان کو سمجھنے کے لیے علم کی دنیا سے تعلق رکھنا کس قدر ضروری ہوتا ہے **اللہ: ماورا کی تلاش** اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

مغربی تحقیقی اقلیموں میں معرضِ وجود میں آنے والے تحقیقی معیارات سے استفادہ کرنا انتہائی ناگزیر حقیقت ہوتے ہوئے بھی عکسی مفتی کا سائنسی تجرباتی دانش سے ہٹ کر لسانی توضیحاتی ادراک کا

سہارا لینا منطقی اثباتیت کے سارے کے سارے مادی اور میکانکی کھیل کا بوریا بستر گول کر گیا ہے اور یوں زبان میں موجود مابعد الطبیعیاتی حوالوں کو از سر نو پذیرائی بخشی گئی ہے۔ اسمائے حسنٰی کہ جس کا لب لباب کبھی اسم اعظم کے حوالے سے ہماری داستانوں میں مشکل کشائیوں کا باعث بنتا تھا اور کھل جا سم سم سے آگے سفر نہیں کرتا تھا، تلاش میں ان مقدس اسما کو سائنسی بلندیوں سے جوڑ دیا گیا ہے۔ اس تناظر میں صلح کل کا پیغام یوں دیا گیا ہے:

> اللہ الجامع ہے۔ یعنی منعکس ہے کل ہے جو جزو کو معنویت دیتا ہے۔[۱۴]

عکسی مزید لکھتے ہیں:

> اللہ ہی وہ واحد اور یکتا آئیڈیل، وہ آدرش ہے جو پوری بنی نوع انسان کو تمام اختلافات اور انحرافات سے بالا تر ہو کر ایک وحدت میں جوڑ دیتا ہے۔ یہ کل کی ایک بے مثل خصوصیت ہے جو اس کے اجزا میں نہیں ملتی۔[۱۵]

عکسی مفتی نے خدا کی موجودگی کے علمی ثبوتوں پر مبنی اپنی انگریزی کتاب میں اپنے عہد تک ہونے والی سائنسی، مذہبی، لسانی، بشریاتی اور منطقی تحقیقوں کی مدد سے جس نقطۂ نظر کو فروغ دیا ہے اس سے راہ گم کردہ انسانیت کو راہ راست پر آنے میں کافی مدد مل سکتی ہے۔ اگر اس کتاب میں موجود سائنسی دلیلوں سے امام غزالی کا سابقہ پڑتا تو شاید انھیں کچھ وقت کے لیے بھی تشکیک کی وادیوں میں نہ گھومنا پڑتا۔ بعد ازاں اگر علامہ اقبال نے بھی فکری تحقیق کے اصول اول تشکیک کے ساتھ دنیا میں کچھ وقت گذارا تھا تو ان کے لیے بھی اس نوع کی کتاب کی موجودگی راہنمائے بے بدل کا کام دے سکتی تھی۔

سائنس نے اضافیت، اور کوانٹم فزکس کے تناظر میں جن حقائقی نظریات کا بول بالا کیا ہے ان کی مدد سے پڑھے لکھے لوگوں کے لیے ممکن نہیں رہا کہ وہ ماورا کے اس گھومتے دائرے سے منکر ہو سکیں جو بیک وقت کائنات کے اندر بھی موجود ہے اور اس کے باہر بھی۔ باہر سے میری مراد ماورا ہے جس کا مادی کائنات پر محض تجلی کی حد تک اثر ہوا ہے۔ کن فیکون کے ساتھ نور کے جس برقیے نے مادی کائنات کی تخلیق کی ہے وہ آج بھی اس کے انتہائی چھوٹے ذرے میں اپنے عمل کو جاری رکھے ہوئے ہے۔ یعنی

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید   کہ آ رہی ہے دما دم صدائے کن فیکوں
(اقبال)

یا بقول غالب:

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز   پیش نظر ہے آئنہ دائم نقاب میں

اللہ جل جلالہ کے اسموں کے حوالے سے جن علمی بصیرتوں کا اظہار کیا گیا ہے اس پر تفصیل سے بحث کرنے کے لیے الگ مجالس کی ضرورت ہے۔ سر دست اپنی کم علمی کا اعتراف کرتے ہوئے یہ عریضہ پیش کرنا ہے کہ عکسی صاحب نے ہمیں سوچنے پر آمادہ کیا ہے کہ کیا خدا پر ایمان کے لیے ایمان کافی نہیں ہے؟

ایمان کے لیے کسی سائنس کی ضرورت نہیں پڑتی لیکن اس میں مضائقہ بھی کیا ہے کہ اگر اپنے ایمان کو ہم تجربہ گاہ کے رستے مستحکم کر پائیں۔

مجیبہ عارف نے اس دقیق کتاب کا جس رواں انداز میں ترجمہ کیا ہے اس کے لیے ان کی زبان دانی اور علمیت کا اعتراف نہ کرنا بھی علمی بخیلی متصور ہوگی۔ اللہ: ماورا کی تلاش میں اللہ جل جلالہ کو ماورا کے تناظر میں دیکھ کر اس کے تعین کے معاملے کو اردو قارئین کے لیے سہل اور قابل فہم بنانے کی جو مساعی جمیلہ مجیبہ عارف کے حصے میں آئی ہے وہ انھی کا حصہ ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو زبان میں ایسے موضوعات کو منتقل کیا جا سکتا ہے کہ جو عصری سائنسی، بشریاتی اور فکری زاویوں سے مالا مال ہیں۔

عکسی مفتی صاحب نے اردو میں سر سید سے شروع ہونے والی روشن خیال سائنسی روایتوں کو مذہبی دانش سے ملانے کی جس نئی روش کو اپنایا ہے وہ علامہ محمد اقبال کے سات خطبات میں اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔ قدرت اللہ شہاب، ممتاز مفتی، اشفاق احمد نے اپنی اپنی کتب میں صوفیانہ خیالوں اور وتیروں کی جو تصویر کشیاں کی ہیں، عکسی مفتی نے ان سے فیض پانے کو بھی اپنے لیے شجر ممنوعہ نہیں جانا۔ سو اللہ جل جلالہ کا، کہ جو ماورا ہے، تعین کرتے ہوئے بھی اس کے امکانات کے

جہانوں کا سمیٹنا انسان کے بس کی بات نظر نہیں آتی ۔اگر خدا متعین ہو جائے تو اسے مسخر کرنا کوئی زیادہ مشکل نہیں رہے گا۔اس لیے یزداں بہ کمند آور اے ہمت مردانہ کو کسی اور تناظر میں دیکھنا ہوگا ۔اور یہ تناظر شیخ اکبر محی الدین ابن عربی نے فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم میں بخوبی پیش کر دیا ہے۔علامہ محمد اقبال نے اول و آخر فنا ، ظاہر و باطن فنا کہہ کر جو تصور پیش کیا تھا اس میں بھی دوامی ہستی یا وجود مطلق کی بقا کا انکار نہیں تھا۔

عکسی مفتی صاحب نے اسماے الٰہی کو بنیاد بنا کر اپنی علمی تحقیق کو وسعت آشنا کیا ہے۔اللہ ، اللہ جل جلالہ تعالیٰ کا اسم ذاتی اور باقی تمام اسم اس کی صفات کو ظاہر کرتے ہیں ۔ یہ ننانوے کے قریب ہیں جیسے رحمٰن، رحیم، قہار، جبار، قادر،مصور، خالق، رزاق، محی، ممیت وغیرہ وغیرہ۔یہ اسمائے حسنٰی ہیں۔ کائنات میں اللہ جل جلالہ کی ذات کی صفات بکھری ہوئی ہیں۔وہ ہمہ وقت اپنے خاص طریقوں سے جلوہ گری کر رہا ہے۔اللہ اپنی احدیت میں یکتا ہے۔اس کے کئی تجلیاتی مراتب ہیں۔وہ بے مثل ہے۔ اس کی الوہیت اس کی حکمتوں پر دال ہے۔یہ حکمتیں اللہ تعالیٰ کے اسما اور صفات سے متعلق ہیں۔وہ انا ے مطلق ہے اور اس کی انسانی تخلیق انا ے مقید کی پابند ہے۔ اللہ جل جلالہ واجب ہے اور اس کی تخلیقات ممکنات کہلاتی ہیں۔ وہ اوتار کی صورت اختیار نہیں کرتا یعنی اس کا کسی میں حلول ممکن نہیں۔ اس قسم کا تصور اسما و صفات خدا وندی کے منافی ہے۔ وہ بندے کے ساتھ متحد بھی نہیں ہوتا۔یعنی اللہ جل جلالہ، اللہ ہے اور بندہ بندہ۔یہ تفریق وتمیز ضروری ہے۔خدا نے کسی کا اثبات نہیں کرنا، انسان اس کا اثبات کرتا ہے اور اپنے دل کو غیر اللہ سے نجات دلاتا ہے۔

خدا ماورائے مادہ ہوتے ہوئے اپنے علم میں جو صورتیں رکھتا ہے وہ اعیان ہیں۔یہ اس کی تجلی ظہور سے وجود پذیر ہو کر مظاہر یا اشیا کی صورت سامنے آتے ہیں۔

> اعیان ثابتہ سے مراد ماہیت اشیا یا حقیقت اشیا ہے۔یعنی اشیا کی وہ صورتیں جو قبل از خلق خالق کے علم میں تھیں۔یہ وہ معلومات الٰہیہ ہیں جو صرف علم الٰہی میں ثابت ہیں۔ ان کا خارجی وجود نہیں ہے۔ان کو صورت علمیہ بھی کہتے ہیں جب ان کا ظہور خارجی طور پر ہوتا ہے اور ہمارے حواس اس کے تحت آتے ہیں تو ان کو مخلوق یا اشیا کہتے ہیں۔اسے ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ تمام اشیاے کائنات علم کے مرتبہ میں ذات

> واجب الوجود یعنی حق سبحانہ تعالیٰ کے اندر باطن میں ہیں اور عین یعنی ظہور کے مرتبہ میں ظاہر وجود میں ہیں۔ایک اور پیرایہ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ اشیا (یا ظاہر وجود)اعیان (یا باطن وجود) کے لئے آئینہ ہیں۔[16]

کائنات کی جملہ اشیا میں اللہ جل جلالہ موجود ہے اس لیے وہ الظاہر ہے۔وہ الباطن بھی ہے کہ اشیا کے باطن میں بھی ہے۔

خاص انسان سے کچھ حسن کا احساس نہیں   صورت دل ہے یہ ہر چیز کے باطن میں مکیں
(اقبال)

وہ ماورا ہے، اس لیے کہ عالم امر یا لامکاں میں ہے۔یہ عالم ارواح بھی ہے:

خدا خود میر مجلس بود اندر لامکاں خسرو   محمد شمع محفل بود شب جائے کہ من بودم

اللہ کے علم میں موجود وہ اشیا، جو خارج میں نہیں ہیں، معدوم کہلاتی ہیں۔ جب کوئی انسان اپنی مرضی کو خدا کی مرضی میں گم کر دیتا ہے تو وہ بقا کا درجہ پا لیتا ہے۔ یوں وہ صفات الٰہیہ سے مستنیر ہو جاتا ہے۔اللہ کے حوالے سے تشبیہ سے گریز کرنا چاہیے تا کہ اسے بندوں کی شکل میں نہ دیکھا جائے۔اسے تنزیہ کے حوالے سے سمجھا جا سکتا ہے۔وہ تشبیہی سلسلوں سے منزہ اور پاک ہے۔کلمہ توحید کی نسبت سے وہ بے مثل، یکتا اور احد ہے اور اس کی ذات میں کوئی اور شریک نہیں ہے۔خودی کا سر نہاں لا الہ الا اللہ۔اللہ تبارک تعالیٰ کا کسی صورت میں تصور اس کی یکتائی اور بے مثلی کی تردید ہے:

دہر جز جلوہ یکتائی معشوق نہیں   ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

یہ کائنات خدا کی تجلی کی مظہر ہونے کے ناتے ذاتی، صفاتی، اسمائی اور فعلی تجلی کی بدولت موجود ہے:

> سالک کی نظر سے ہر شے اوجھل ہوجاتی ہے حتیٰ کہ اس کا اپنا آپ بھی۔تجلی صفاتی میں بندہ کی صفات صفات الٰہی میں گم ہو جاتی ہیں۔تجلی اسمائی میں اسم بندہ اسم الٰہی میں گم ہوجاتا ہے اور تجلی فعلی میں ہر اسم اور ہر صفت حق سبحانہ تعالیٰ کے اسما و صفات کا فعل نظر آنے لگتا ہے۔[17]

سائنس ایک ایسی کارروائی ہے جو ہر لحظہ بدلتی رہتی ہے۔اپنے تجربات کی تعداد میں

اپنے مشاہدات کی ترتیب میں اور اپنے نتائج کی تفہیم میں! سائنس ہر تجربے کو ایک حقیقت قبول کرتی ہے اور اسے اپنے دائرہ علم میں سمونے کی خواہش میں اس دائرے کو وسیع سے وسیع تر کرتی رہتی ہے، نئے تجربات کو قبول کرنے اور انھیں اپنے دائرے میں لے آنے کی اس کوشش میں کئی بار اسے نہ صرف اپنے دائرے کو وسیع سے وسیع تر کرنا پڑتا ہے، بلکہ اکثر انھیں توڑ پھوڑ کر نئے انداز سے مرتب بھی کرنا پڑتا ہے۔ آج کے سائنسی دور میں ایک انتہائی غیر سائنس شناس بھی یہ کہتا ہوا پایا جاتا ہے کہ جناب نیوٹن Newton کے قوانین تو آئن سٹائن Einstein نے غلط ثابت کر دیے ہیں۔ جب آئن سٹائن، نیوٹن کے قوانین کو ناقص سمجھتے ہوئے انھیں رد کر دیتا ہے اور ان کی بجائے ایک نیا انداز فکر ایک نیا طریق ترتیب پیش کرتا ہے تو سائنس جھنجھلا نہیں جاتی، برا نہیں مان جاتی، گالی گلوچ اور مار کٹائی پر نہیں اتر آتی بلکہ آئن سٹائن کو خوش آمدید کہتی ہے، آیئے، بعد میں شوق سے تشریف لایئے اور اپنے خیالات کا اظہار فرمایئے۔ ہم کل کی بات کو یکسر درست نہیں سمجھتے تھے، ہم آپ کی باتوں کو یکسر غلط نہیں سمجھیں گے، آپ جو چاہیں اظہار میں لائیں۔ ہم عقل و شعور سے کام لیں گے۔ آپ کی بات قابل اعتبار دکھائی دی تو قبول کر لیں گے ورنہ وعلیکم السلام۔ نیوٹن کو رد کرتے ہوئے اور آئن سٹائن کو قبول کرتے ہوئے سائنس جنت و دوزخ، جزا اور سزا، ارسطو، افلاطون کی احادیث کی مدد طلب نہیں کیا کرتی، سائنس کا اصول ہے تجربہ experiment پیشگوئی (prediction) اور مزید تجربہ (crucial experiment) یہ سائنسی میلان طبع ہی درحقیقت آزاد خیالی ہے۔[۱۸]

سائنس بدلتے حقائق کے ساتھ ساتھ بدلنے والا علم ہے۔ اس میں تجربے یا لیبارٹری ٹسٹ کو بنیاد بنا کر حقیقتوں یا مفروضوں کی تصدیق کی جاتی ہے۔ یہ ایک کنویں یا دائرے کے اندر رہ کر تو سچائیوں اور صداقتوں کا سراغ لگا سکتی ہے لیکن اپنے دائرہ اختیار سے باہر کی دنیا یا کائنات کے بارے میں قیاسی حوالوں سے کام لینا اس کا مقدر ہے۔ جس طرح چیونٹی کے لیے ممکن نہیں ہے کہ وہ ہاتھی کے وجود پر محیط ہو کر اس کا تصور کر سکے یا اس کی حقیقت کلی کو جان سکے اسی طرح دوربینی مشاہدے کہ جن کی پہنچ ابھی اپنی ہی کہکشاں کے سیاروں اور ستاروں تک نہیں ہے وہ کائنات کی تخلیق و تشکیل کے بارے میں قیاسی

حوالوں کے استعمال تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔

فلسفے ،تصوف اور سائنس کے مطالعاتی طریقہ ہائے کار میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ فلسفے میں تشکیکی ،تصوف میں الہامی اور سائنس میں تجربی طریق کار کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔ ان کے حوالے سے یہ کہنا ممکن ہے کہ یہ اپنے اپنے طریق کار میں تیقن کی حد تک صداقت یابی کے دعوے دار ہیں۔ سائنس کی استقرائیت اور فلسفے اور تصوف کی استخراجیت ان سب کو ایک منزل تک لا کر بے یارومددگار چھوڑ دیتی ہے۔ سائنس نے بگ بینگ کو زمان و مکاں یا ٹائم اینڈ سپیس کا خالق قرار دیا ہے۔ تصوف نے ذات باری تعالٰی کی تخلیقی صلاحیتوں کی نشان دہی کی ہے اور فلسفے میں تاہنوز تخلیق کائنات کا مسئلہ الجھا ہوا ہے اور آخر میں سارتر کو یہ کہنا پڑتا ہے کہ میں ان سوالات میں الجھنا ہی نہیں چاہتا کہ میں دنیا میں کیسے موجود ہوں۔ میں موجود ہوں اس لیے اب مجھے اپنے جوہر کی تشکیل سے عہدہ برآ ہونا ہے۔ خدا یا خالق کائنات کا مسئلہ میری تحقیق، تلاش اور دریافت کے دائروں سے باہر کا مسئلہ ہے۔ سو اس صورت حال میں اول و آخر ایک کنفیوژن کا سامنا ہے۔ نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم ہے کہ تاریخ انسانی میں کائناتوں کے ہاتھیوں کو چیونٹی ہی کی نظر سے دیکھا گیا ہے، دیکھا جا رہا ہے اور دیکھا جاتا رہے گا۔

جب ہم جانداروں کو فنا ہوتا دیکھتے ہیں اور کائنات کو بدستور قائم و دائم ہی نہیں کن فیکونی کی حالت میں پھیلتا اور بڑھتا پاتے ہیں تو لا محالہ موجودگی کی وضاحت ہمیں کسی ایسی ہستی کی جانب لے جاتی ہے جو ماورائے زمان و مکاں ہے اور جس کی بدولت ٹائم اور سپیس کے سلسلے جاری و ساری ہوئے ہیں۔ چنانچہ صوفی اور فلسفی ہر شے یا ہر مسئلہ کو ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ جانتے ہیں کہ انھیں تمام کثرتیں وحدتوں میں ڈھلی نظر آتی ہیں۔ اب سائنس نے بھی تمام کثرتوں کے پیچھے ایسی وحدت کا سراغ لگایا ہے جو ان سب کو ایک دوسرے سے باندھے ہوئے ہے۔ ڈی این اے کی نشو ونما اور کثرت کے پیچھے نفس واحد کی حقیقت کو تسلیم کیا جا چکا ہے۔ شاعرعظیم اسداللہ غالب کے یہ اشعار دیکھیے:

قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل　　　　کھیل لڑکوں کا ہوا دیدہ بینا نہ ہوا

نہ پوچھ نسخۂ مرہم، جراحتِ دل کا		کہ اس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے
کچھ نہ کی، اپنے جنونِ نارسا نے، ورنہ یاں		ذرہ ذرہ، روکشِ خورشیدِ عالم تاب تھا
بے پردہ سوئے وادیِ مجنوں گذر نہ کر		ہر ذرہ کے نقاب میں دل بیقرار ہے
سازِ یک ذرہ نہیں، فیضِ چمن سے بیکار		سایۂ لالۂ بے داغ سویدائے بہار
جامِ ہر ذرہ ہے سرشارِ تمنا مجھ سے		کس کا دل ہوں کہ دو عالم سے لگایا ہے مجھے؟
نظر میں ہے ہماری، جادۂ راہِ فنا، غالبؔ!		کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا
یک قدم وحشت سے، درسِ دفترِ امکاں کھلا		جادہ، اجزائے دو عالم دشت کا، شیرازہ تھا
سب کو مقبول، ہے دعویٰ تری یکتائی کا		روبرو کوئی بتِ آینہ سیما نہ ہوا

حسی اور فکری علم کا تعلق موجود اور غیر موجود معروضوں کے ادراک اور تصور سے ہے۔اشیا کے کیف وکم کو جاننے کے لیے ادراکی وتصوراتی طریقے بروئے کار آتے ہیں۔یہ طریقے ان کی صفات اور حالتوں کا جائزہ بھی لیتے ہیں۔ایک سوال نے جدید فلسفیوں اور ماہرین علوم کو پریشان کر رکھا ہے کہ کیا سب کچھ اس لیے موجود ہے کہ ہمارا ذہن موجود ہے یعنی آئی تھنک دیئر فور آئی ایم!(I think therefore I am) کی منطق نے الجھاوا پیدا کیا ہے۔ورنہ اگر ہم نہیں ہیں تو بھی اشیا کا اپنا وجود قائم و دائم ہے۔اگر یہ وجود قائم و دائم ہیں تو ان کی حدود کیا ہیں ؟ کیا انسانی دماغ ان حدود کا احاطہ کرسکتا ہے ؟یہ اور اس نوع کے کئی اور سوالات ہیں کہ جو حقیقت مطلق کو جاننے کے حوالے سے اہمیت رکھتے ہیں۔

حقیقت مطلق کی اصطلاح سائنس اور غیر مذہبی فلسفوں کے لیے قابل قبول نہ ہوتا ہم اتنا

ضرور ہے کہ انسان کی نظر خوگر پیکر محسوس ہے اس کے لیے ان دیکھے خدا کو تسلیم کرنا صرف اور صرف ایک حوالے سے ممکن ہے اور وہ حوالہ ہے ایمان کا!یعنی مذہبی حوالہ!

شاخ پہ پھول کہ منبر پہ رسول		حق جسے جان لیا مان لیا!

آج فلسفے ہر نوع کے طریق ہائے کار کے بارے میں نظریات سازی کے عمل میں مصروف ہیں اور یوں معاملے اور باتیں ساختوں کی ساخت اور معنی کے معنی تک پہنچ چکی ہیں اور یوں طریق ہائے کار کی اپنی حقانیت بھی تشکیک کی زد میں ہے۔اس حوالے سے سائنس ہی کو لے لیجیے جو علت اور معلول کے سلسلوں کی سب سے بڑی داعی ہے۔ وہ اگر بگ بینگ کو ایک حادثہ جانتی ہے تو ہمارے ذہنوں میں یہ سوال ضرور ابھر سکتا ہے کہ تخلیق پہلے ہے یا خالق ؟ کیا تخلیق بغیر خالق کے ممکن ہے؟ کیا حادثاتی تخلیق کا کوئی ایسا خالق موجود نہیں ہو سکتا جو علت و معلول کے سلسلوں سے باہر ہو؟ نظام کائنات کی درست تفہیم کے لیے وجود مطلق کو تسلیم کرنا لازمی ہے اور یوں یہ بھی ناگزیر ہے کہ اسے علت و معلول کے سلسلوں سے باہر دیکھنے پر اکتفا کیا جائے ورنہ معاملے لاینحل ہو جائیں گے اور ہمارے مفکر اور سائنس دان مرغی اور انڈے کی اولیت کے جنجالوں میں پھنسے رہیں گے۔

کائنات خدا کا مظہر ہے۔ذات خداوندی ایک چھپا ہوا خزانہ تھی۔اس نے چاہا کہ وہ پہچانی جائے اس نے دنیا پیدا کر دی۔یوں جو اشیا اپنی پیدائش کے لیے دنیاوی علوم کی محتاج نہیں ہیں، بلکہ ان سے ماورا ہیں،تو یہ علم ان کا احاطہ کرنے کے قابل بھی نہیں ہے۔

ہمارے حواس ادراک حقیقی کے حامل ہوتے ہوئے بھی بسا اوقات اس کے ظاہری روپ میں کھو کر رہ جاتے ہیں۔مجازی حوالے کو بنیاد بنا کر اصل حقیقت کا ادراک نہیں کر پاتے۔ سائنس حقیقت شناسی کی مدعی تو ہے لیکن اس پر وہ حقیقت کیسے کھل سکتی ہے جو تمام مظاہر کا منبع و مخرج ہے۔البتہ اتنا ضرور ہے کہ وہ کسی مظہر کے بطن میں اتر کر کسی ایسے اصول کی نشان دہی کرے کہ جو کسی مطلق طاقت کے بغیر ممکن نہ ہو۔ سو قطرے میں دجلہ یا ذرے میں شمس دکھائی دینے والے سلسلے کا علمی اعتراف جس دیدہ بینا کا متقاضی ہے اسے ظاہر داری سے نسبت نہیں ہے۔

جدید ایٹمی سائنس نے ایٹم کے صغیر ترین پارٹیکل میں جس برقی کوندے کا سراغ لگایا ہے

اس کی روشنی ہمیں اس تصور کو سمجھنے کی جانب لے جا سکتی ہے کہ جو "اللہ نورالسموات ولارض" کی نسبت سے ہمارے سامنے آتا ہے۔ سائنس نے مادے کی جن چار سطحوں کی بات کی ہے ان میں مالی کیولز، ایٹمز، ایٹمی نیوکلیس اور پُرقوت ایٹمی طاقت شامل ہیں۔ مالی کیولز ایٹمز کے مختلف کمبی نیشنز ہیں۔ ایٹم کی ساخت میں وہ وہ الیکٹرونز موجود ہیں جو الیکٹرومیگنیٹک قوت کے حامل ایک چھوٹے نیوکلس سے جڑے ہوئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اگر ایک ایٹم کو کسی دوسرے کے قریب کیا جائے گا تو دونوں میں موجود الیکٹرونز اور الیکٹرومیگنیٹک قوت کے حامل نیوکلس ایک دوسرے پر اثر انداز ہوں گے اور یوں دونوں کو وہ طاقت ملے گی جو ایٹمز کو مالی کیولز سے مربوط کرتی ہے۔ اسی طرح ایٹم کو توڑنے کا عمل بھی ہے کہ جو ہر مربوط کرنے والی طاقت میں ایسا گیپ پیدا کر دیتا ہے کہ جس سے جڑی ہوئی اور مربوط اشیا اور وجود تباہ ہو جاتے ہیں۔ ایٹم کے تناظر میں پروٹونز، نیوٹرونز، فوٹونز، پیرون کی دریافتوں نے سائنس کو نئے امکانات کی جانب مائل کیا۔[19]

اس حوالے سے یہ اشعار ہماری معاونت کر سکتے ہیں:

موجِ سرابِ دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال　　ہر ذرہ، مثلِ جوہرِ تیغ، آب دار تھا
یک ذرۂ زمیں نہیں بے کار، باغ کا　　یاں جادہ بھی، فتیلہ ہے لالہ کے داغ کا
شوق ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز　　ذرہ صحرا دست گاہ و قطرہ، دریا آشنا
ہر ایک ذرۂ عاشق ہے آفتاب پرست　　گئی نہ خاک ہوئے پر، ہوائے جلوۂ ناز
ہے تجلی تری سامانِ وجود　　ذرہ بے پرتوِ خورشید نہیں
از مہر تابہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ　　طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ
ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے　　پرتو سے آفتاب کے، ذرہ میں جان ہے
ہے وہی بدمستیِ ہر ذرہ کا خود عذر خواہ　　جس کے جلوے سے زمیں تا آسماں سرشار ہے
ہے ذرہ ذرہ تنگیِ جا سے غبارِ شوق　　گر دام یہ ہے، وسعتِ صحرا شکار ہے

سراب کا تلوار کے جوہر کی مانند چمکدار ہونا، جادے کا لالے کے داغ کا فتیلہ بننا، ذروں سے مل کر صحرا بننا، ذروں کا آفتاب پرست ہونا، تجلی کا سامان وجود بن جانا، سورج سے ذرے تک دلوں کے چمکتے آئینے دیکھنا، آفتاب کے پرتو سے ذروں میں تحرک کا جنم لینا، یعنی ہر ذرہ کائنات کا دھڑکنا، اور زمیں تا آسمان جو سرشاریاں موجود ہیں، ان کی وجہ کسی کے جلوے کی موجودگی کو ٹھہرانا اور پھر کائنات میں مادے کا پھیلاؤ یا وسعت آشنا نظر آنا۔ یہ وہ اشارے ہیں کہ جن کو شاعروں نے وجود مطلق کے جلوے کے پرتو کے حوالے سے پذیرائی بخشی ہے اور یوں وہ وحدت الوجود کے صوفیانہ تصورات کی جانب متوجہ رہے ہیں یعنی:

جگ میں آ کر ادھر ادھر دیکھا　　تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

سائنس نے اس حقیقت کا سراغ لگا لیا ہے کہ دنیا کی ہر شے کے پیچھے کوئی شیرازہ بند طاقت ہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام نے اپنی ایٹمی تحقیق کا لب لباب جس کمزور برقیاتی یونٹ کی دریافت کے حوالے سے پیش کیا ہے وہ مادے کی وحدت کا نقیب ہے۔ اسے انسانوں کے حوالے سے تخلیق آدم کے سلسلے میں بھی دیکھا جا سکتا ہے یعنی خدا نے انسان کو مٹی سے پیدا کیا اور پھر اس میں اپنی روح پھونک دی۔ یہ روح کائنات کے کبیر ترین نورانی وجودوں سے لے کر صغیر ترین پارٹیکلز تک ہر جگہ موجود ہے اور یوں باری تعالیٰ کی وحدانیت پر بھی مہر تصدیق ثبت ہوتی ہے۔

اقبال سمیت تمام مسلم دانشوروں نے اسلامی افکار میں موجود آزادی، برابری، بھائی چارے اور عالمی انسانی معاشرے کے قیام کے تصورات کی نشان دہی کرتے ہوئے حریت اور مساوات کے اصولوں پر مبنی نظام حیات کی بنیادی شرائط کو پورا کرنے کے لیے استحصال سے پاک پاکیزہ معاشرے کی تشکیل کی آرزو کی ہے۔ اس نوع کا معاشرہ نسلی اور تہذیبی برتری یا کمتری کے تصورات سے مکمل طور پر پاک ہوگا۔ اس میں وحدت انسانی کے تصور کو نمایاں کیا جا سکے گا۔ اس معاشرے میں حاکم اعلیٰ خدا کی ذات ہوگی اور انسان دنیا میں اس کا نائب یا امانت دار ہوگا۔ غیر طبقاتی توحید آشنا سماج ہی جدید انسانوں کو مادی استحصالی نظاموں سے نجات دلا سکتا ہے۔

حواشی و حوالہ جات

* پروفیسر و سابق صدر شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی، لاہور۔

ا۔ الف دنیم، مسئلہ وحدۃ الوجود اور اقبال (لاہور: بزم اقبال، ۱۹۹۲ء)، ص ۱۱۔

۲۔ المحصل ناشرین، اللہ ماورا کی تلاش، دعوت نامہ بزبان انگریزی (لاہور، ۲۱ دسمبر ۲۰۱۲ء)، ص ۴۔

۳۔ الف دسیم، اردو شاعری کی مذہبی اور صوفیانہ مصطلحات، قلمی نسخہ مملوکہ راقم الحروف، ص ۵۹۳۔

۴۔ المحصل ناشرین، اللہ ماورا کی تلاش، دعوت نامہ بزبان انگریزی، لاہور، ۲۱ دسمبر ۲۰۱۲ء، ص ۲۔

۵۔ البیرونی، کتاب الہند، مترجم سید اصغر علی (لاہور: المحصل ناشران کتب، ۲۰۱۰ء)، ص ۲۷۔

۶۔ ایضاً، ص ۲۹۔

۷۔ ایضاً، ص ۲۹۔

۸۔ ایضاً، ص ۲۹۔

۹۔ ایضاً، ص ۳۱۔

۱۰۔ ایضاً، ص ۳۳۔

۱۱۔ عبدالسلام، ابن عربی کا نظریہ وحدۃ الوجود، مرتب سعادت سعید (لاہور: اقبال سٹریٹجک فاؤنڈیشن، ۱۹۹۲ء)، ص ۱۷۔

۱۲۔ ایضاً، ص ۲۵۔

۱۳۔ احمد جاوید، "عہد حاضر میں فلسفۂ تشکیک کے اثرات (ایک نشست)" مجلہ راوی لاہور، شمارہ ۹۹ (۲۰۱۲ء)، ص ۱۲۔

۱۴۔ عکسی مفتی، اللہ ماورا کی تلاش، مترجمہ ڈاکٹر نجیبہ عارف (لاہور: المحصل، ناشرین کتب، ۲۰۱۲ء)، ص تعارف۔

۱۵۔ ایضاً۔

۱۶۔ مسئلہ وحدۃ الوجود اور اقبال، ص ۱۳۔

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۴۔

۱۸۔ عزیز الحق، مضامین (لاہور: محمد بشیر (ناشر)، ۱۹۷۷ء)، ص ۳۸۔

۱۹۔ اس کی وضاحت یوں ممکن ہے:

Today all the matter in the universe is viewed as being composed of three kinds of elementary objects: (1) particles called quarks, which make up neutrons and protons; (2) particles called leptons, which include electrons and some similar particles; and (3) particles called bosons, or vector mesons, which include the photons seen as light and which carry the electromagnetic force. Other bosons are similar particles that carry the other forces. The forces in nature and the view of how they work cannot be separated from the constituents of matter. Some scientists suggest that leptons and quarks may actually be the same object but in different states. Bosons, too, may be this same object but in still another state.

منذر الہٰی لکھتے ہیں:

دراصل کائنات میں چار ایسی قوتیں موجود ہیں جن سے کائنات کا نظام چل رہا ہے۔ آئن سٹائن یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ آخر

وہ کوئی واحد اور مشترک قوت ہے جو کائنات کو چلانے والی چار بڑی قوتوں کو کنٹرول کر رہی ہے اور ان قوتوں کو منتشر ہونے سے بچائے ہوئے ہے اور یہی اس (آئن سٹائن) کی کوشش تھی کہ وہ اس بنیادی قوت کو دریافت کرکے واحد قوت کا نام دے سکے۔ ڈاکٹر سلام کے نظریہ کے ذکر سے پہلے ہم ان چاروں قوتوں کا فرداً فرداً جائزہ لے لیں جنھوں نے اپنے مرکز کی تلاش میں تمام سائنسی دنیا کو پریشان کیا ہوا ہے کشش ثقل (the gravitational force) یہ قوت کسی دو اجسام کے درمیان کشش اور مرکزیت کو قائم رکھنے کی قوت ہے۔ یہ قوت تمام کائنات میں سیاروں کے مقررہ مقام کا تعین اور گرتے ہوئے اجسام کو کنٹرول کرتی ہے۔ برقی مقناطیسی قوت (the electromagnetic force) یہ قوت کسی دو مخالف بار والے ذرات کو باہم مربوط کرتی ہے یعنی ایک منفی بار والا الیکٹران اور ایک مثبت بار والا پروٹان۔ اسی قوت کے ذریعے ایٹم باہم اکٹھے اور یکجا رہتے ہیں۔ کمزور ایٹمی قوت (the weak nuclear force) یہ طاقت radioactivity کے عمل میں کارپرداز ہے اور کائنات میں بھاری عناصر کے قیام پذیر ہونے کی ذمہ دار ہے۔ مضبوط ایٹمی قوت (the strong nuclear force) یہ قوت کسی ایٹم کے مرکزہ یعنی نیوکلیس کو اپنی جگہ پر قائم اور مرکوز رکھتی ہے۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ آئن سٹائن دراصل انھی چار مذکورہ بالا قوتوں کو کنٹرول اور یکجا کرنے والی کسی ایک واحد قوت کی تلاش میں تھا۔ آئن سٹائن نے gravity کو electricity کے ساتھ یکجا کرنے اور ایک واحد قوت اخذ کرنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ اسی طرح انیسویں صدی میں Maxwell نے electricity اور magnetism کے ملاپ کی کامیاب کوشش کی۔ اب جو کام ڈاکٹر سلام نے کیا وہ بالکل سابقہ دو تجربات سے مشابہ اور مماثل ہے۔ لیکن پروفیسر سلام ایک مختلف طور پر دو قوتوں یعنی the weak nuclear force اور the electromagnetic force کے باہم ملاپ میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اگرچہ پروفیسر سلام نے اپنی ایک تھیوری پیش گوئی کی صورت میں ۱۹۶۷ء میں پیش کی تھی جس کے بعد جنیوا اور سٹینفرڈ کی تجربہ گاہوں میں ڈاکٹر صاحب کی تھیوری پر دقیق اور پیچیدہ تجربات کیے گئے اور بالآخر ان عملی تجربات کے دور سے گزرنے کے بعد آج ڈاکٹر صاحب کا نظریہ عالمی سطح پر سائنس کی دنیا میں تسلیم کر لیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب کے ملاپی نظریہ کا موازنہ اس نظریہ سے کیا جا سکتا ہے جس کے مطابق درخت سے گرتا ہوا سیب ہر حال میں زمین پر ہی گرے گا۔ اور مختلف سیارے اور اجسام کائنات میں قیام پذیر رہیں گے۔ وہ قوت اور اصول دراصل ایک ہی ہے جو سیب کے زمین پر گرنے اور سیاروں کے خلا اور مدار میں قائم رہنے میں کارفرما ہے۔ ڈاکٹر سلام کی Unified Theory کے مطابق the weak nuclear force بذات خود کوئی قوت نہیں لیکن یہ ایک ایسی واحد قوت کا ایک حصہ ہے جس کا دوسرا حصہ the electromagnetic force ہے چنانچہ تجربات سے یہ ثابت ہو گیا کہ یہ ایک ہی واحد قوت کے دو حصے ہیں اس نئی قوت کو ڈاکٹر سلام نے electro weak force کا نام دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا کارنامہ یہ ہے کہ جن دو قوتوں کو برسوں سے سائنس دان دو مختلف چیزیں سمجھ رہے تھے وہ دراصل ایک ہی کل کے دو جز ہیں ڈاکٹر عبدالسلام کا یہ نظریہ سائنس کی دنیا کا ایک اہم سنگ میل ثابت ہوگا۔

ڈاکٹر سلام کی دریافت شدہ نئی electro weak force یقیناً دو قوتوں کو یکجا کرنے میں ایک نہایت اہم اور جامع کردار ادا کرے گی اور نہ جانے تحقیق اور تجربے کی کتنی ہی راہیں صرف ڈاکٹر سلام کے مقالے سے وا اور روشن ہوں گی۔ اب چونکہ ڈاکٹر صاحب کی نئی تھیوری کے مطابق کائنات کی بنیادی قوتوں کی تعداد چار سے گھٹ کر تین رہ گئی ہے یعنی۔

۱۔(the strong nuclear force) ۲۔(gravitational force) ۳۔(electro weak force) لہٰذا اب اگلا

مرحلہ electro weak force اور strong nuclear force کی یکجائی اور ملاپ کا ہے۔چنانچہ چند دوسرے سائنس دانوں کی طرح ڈاکٹر صاحب نے بھی ان دونوں قوتوں کی ملاپی تھیوری پیش کر دی ہے جس کو ثابت کرنے کے لئے ابھی تجربات کی بھٹی سے گذرنا پڑے گا تب جا کر مذکورہ نظریے کے حق میں ٹھوس دلائل حاصل ہو سکیں گے۔ڈاکٹر صاحب نے یہ نظریہ بھی پیش کیا ہے کہ پروٹان ایک مقررہ معیاد اور وقت گزرنے کے بعد یعنی ۱۰۳۳ سال گذرنے کے بعد نا قیام پذیر صورت اختیار کر لیتا ہے۔لہٰذا اب پروٹان کی معیاد زندگی کی پیائش کے لیے امریکہ کی تجربہ گاہوں میں نئے تجربات زیر ترتیب اور تکمیل ہیں جو مستقبل میں نئی تھیوری کو ثابت کرنے میں فیصلہ کن کردار ادا کریں گے۔ دوسری جانب اگر ایک مختلف پہلو سے ڈاکٹر سلام کے نظریہ کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب نے جس طبیعی مسئلے کو حل کیا ہے وہ آج تک مذہب اور سائنس کے درمیان وجہ نزاع بنا رہا۔پروفیسر موصوف نے ثابت کیا ہے کہ کائنات میں ایک بنیادی واحد قوت کارفرما ہے۔ جسے فلسفہ حقیقت اولیٰ اور مذہب خدائے واحد کا نام دیتا ہے۔ مادہ پرستوں پر کاری ضرب تو آئن سٹائن ہی نے یہ کہہ کر لگا دی تھی کہ مادہ فانی ہے اور یہ توانائی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اب اس کے تابوت میں آخری کیل پروفیسر سلام نے ٹھونک دی ہے اور یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ کائنات میں مادہ سرے سے وجود ہی نہیں رکھتا ہر مادے کا ایک ضد مادہ موجود ہے جو اس کے ساتھ مل جانے پر مادے کو معدوم کر دے گا اور باقی صرف واحد قوت رہ جائے گی۔ یہ کوئی مذہبی اور مافوق الفطرت بات نہیں ایک طبیعی حقیقت ہے۔ جسے پروفیسر صاحب نے ثابت کیا ہے۔ اب کسی حد تک یہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہ مادی عالموں کا پھیلتا ہوا بکھیڑا جسے ہم اپنی بڑی بڑی دوربینوں، فوٹو پلیٹوں اور طیف پیماؤں سے دریافت کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ایک اور صرف ایک بلکہ واحد مطلق اور لامتناہی آزادیاں رکھنے والی توانائی کی عملی نیرنگیاں ہیں۔ظلمت اور نور، برقیت اور مقناطیسیت، مادہ اور توانائی، کمیت اور کیفیت، حرکت اور سکون، خیر اور شر سب متضاد کیفیات ایک ہی بنیادی حقیقت کے مختلف مظاہر ہیں۔

(وحدت کی تلاش،منذر الہٰی، بحوالہ مجلّہ راوی شمارہ۲ (دسمبر۱۹۷۹ء)،گورنمنٹ کالج لاہور)۔

مآخذ

البیرونی۔ کتاب الہند۔مترجم سید اصغر علی۔لاہور:الفیصل ناشران کتب،۲۰۱۰ء۔

الفیصل ناشرین۔اللہ ماورا کی تلاش،دعوت نامہ بزبان انگریزی۔لاہور،۲۱ دسمبر۲۰۱۲ء۔

جاوید،احمد۔"عہد حاضر میں فلسفۂ تکنیک کے اثرات (ایک نشست)"۔مجلّہ راوی ۔لاہور،شمارہ۹۹ (۲۰۱۲ء) ص ۱۲۔

عبدالسلام،ابن عربی کا نظریہ وحدۃ الوجود۔مرتب سعادت سعید۔لاہور:اقبال ٹرسٹ فاؤنڈیشن،۱۹۹۲ء۔

عزیز الحق۔ مضامین۔لاہور:محمد بشیر(ناشر)،۱۹۷۷ء۔

مفتی بگھی۔ اللہ:ماورا کی تلاش ۔مترجمہ ڈاکٹر نجیبہ عارف۔لاہور:الفیصل، ناشرین کتب،۲۰۱۲ء۔

نسیم،الف د۔اردو شاعری کی مذہبی اور صوفیانہ مصطلحات۔قلمی نسخہ،مملوکہ راقم الحروف۔

_____۔مسئلہ وحدۃ الوجود اور اقبال۔لاہور:بزم اقبال،۱۹۹۲ء۔